حرف آغاز

جہاد کے احکام

سید جلال الدین عمری

جہاد کے بعض احکام کا اس سے قبل ذکر آچکا ہے۔[1] یہاں مزید دو احکام کی وضاحت کی جارہی ہے۔ ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔ کسی فرد کو جہاد پر نکلنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے ذمے کسی کا حق تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے اس کی فکر کرنی ہوگی۔ اسے نظر انداز کر کے جہاد کے لئے کھڑا ہو جانا صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے ہدایت کی ہے کہ جہاد میں شرکت سے کسی کا حق ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اگر اس کا قوی اندیشہ ہو تو جہاد میں شرکت درست نہیں ہے۔

شہادت سے قرض معاف نہیں ہوتا

صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ کے راستے میں خلوص کے ساتھ جان دی ہے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، لیکن قرض اس کے ذمہ ہے تو معاف نہ ہوگا۔ حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور (خطبہ) ارشاد فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ تمام اعمال میں افضل ہیں۔ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میں اللہ کے راستے

---

[1] ملاحظہ ہو سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۲ء

میں جان دے دوں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا:

نعم ان قتلت فی سبیل اللہ و انت صابر، محتسب، مقبل، غیر مدبر

ہاں! اگر تم اللہ کے راستے میں اس طرح مارے گئے کہ میدان میں پامردی کے ساتھ جمے رہے، اللہ سے اجر وثواب کی توقع وابستہ رکھی، تمہای پیش قدمی جاری رہی، اور تم نے پیٹھ نہ دکھائی (تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام قصور معاف کر دے گا۔)

تھوڑی دیر بعد آپ نے اس سے کہا کہ اپنا سوال پھر دہراؤ۔ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔ آپ نے وہی جواب دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

إلّا الدین، فان جبریل علیہ السلام قال لی ذالك [1]

لیکن تمہارے ذمہ کسی کا قرض ہے تو وہ معاف نہیں ہوگا۔ جبریل نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یغفر للشهید کلّ ذنب إلّا الدین [2]

شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے سوائے قرض کے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آتی ہے کہ

---

[1] مسلم: کتاب الامارۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین۔ بعض روایات میں تفصیلات میں کسی قدر فرق ہے، ملاحظہ ہو۔ نسائی: کتاب الجہاد، باب من قتل فی سبیل اللہ وعلیہ دین۔

[2] مسلم: حوالہ سابق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

القتل فی سبیل اللہ یکفر کل خطیئۃ فقال جبریل: الا الدین، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إلا الدین۔ [۱]	اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دینا (وہ عمل ہے جو) ہر گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ اس پر حضرت جبریل نے آپؐ سے کہا: سوائے قرض کے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: سوائے قرض کے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاد میں پورے خلوص اور استقامت کے ساتھ شرکت ہو اور اس کے تقاضے پورے کیے جائیں، تو سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوگا۔ اگر وہ ادا نہ ہوا تو اس کی ضرور باز پرس ہوگی۔

علامہ شوکانی اس موضوع سے متعلق احادیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ان میں اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد سے تمام گناہ اور قصور معاف ہو جاتے ہیں بشرطے کہ وہ اللہ کے راستے میں ہو، اس سے اجر و ثواب کی طلب پیش نظر رہے اور آدمی محاذ جنگ پر پسپائی نہ اختیار کرے۔ شہید مغفرتِ عامہ کا مستحق ہوتا ہے۔ البتہ اس سے 'دیونِ لازمہ' (یعنی ایسے قرض جن کی ادائیگی لازم ہے) معاف نہیں ہوں گے۔ یہ شہادت کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ان کا تعلق انسانوں کے حقوق سے ہے۔ یہ اُسی وقت ساقط ہوں گے۔ جب کہ متعلقہ شخص اپنی مرضی، خوشی اور اختیار سے انہیں ساقط کر دے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی نماز جنازہ نہیں ادا کی جس پر قرض تھا۔[۲]

---

۱ ترمذی: کتاب فضل الجہاد، باب ما جاء فی ثواب الشہداء

۲ نیل الاوطار: ۷/ ۲۵۱۔۲۵۲، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی۔ مصر ۱۹۷۱ء

سوال یہ ہے کہ اگر قرض دار جہاد میں شریک ہونا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ اگر اس نے ادائیگی کا نظم کر دیا ہو، یا کوئی اس کی طرف سے ادائیگی کی ضمانت لے لے تو وہ جہاد پر جا سکتا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ دائن (قرض دینے والا) کی اجازت سے وہ جہاد پر جا سکتا ہے، اگر وہ اجازت نہ دے تو نہ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرض فوری طور پر واجب الادا ہو تو دائن کی اجازت ہونی چاہئے، ورنہ اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی قانونی حیثیت بیان کرتے ہوئے قاضی شوکانی کہتے ہیں:

''اس سلسلے کی احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شہید کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے، سوائے قرض کے اگر وہ ادا ہونے سے رہ جائے۔ اس سے یہ استدلال صحیح نہ ہوگا کہ جب تک دائن کی اجازت نہ ہو، آدمی جہاد پر نہیں جا سکتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ اگر آدمی یہ چاہے کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں تو اسے دائن سے اجازت لینی چاہئے۔ اگر وہ سوچے کہ ایک گناہ کی مغفرت نہ ہونے کے باوجود عمومی ثواب کی خاطر اسے جہاد پر جانا چاہئے تو وہ جا سکتا ہے۔ یہ اس کے لئے جائز ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ اسے قرض فوری طور پر ادا کرنا ہو۔ لیکن اگر اس میں تاخیر کی گنجائش ہو تو اس میں دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس صورت میں بھی دائن (قرض دینے والا) سے اجازت لینی چاہئے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اسے دائن سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت سفرِ تجارت کی سی ہے۔ (جب وہ تجارت کے لئے سفر کر سکتا ہے تو جہاد کے لئے بھی کر سکتا ہے۔)[1]

حدیث میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے قرض لے

---

[1] نیل الأوطار: ۷/۲۵۲

رکھا ہے، اسے اس نے ادا نہیں کیا، یا اس کے ادا کرنے کا اس کا ارادہ نہیں ہے تو راہِ خدا میں جان دینے کے باوجود وہ معاف نہیں ہوگا اور اللہ کے ہاں اس کی اسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس پر قرض دار کا یہ سوچنا، حدیث کی روح کے منافی ہے کہ وہ قرض کی فکر کئے بغیر مغفرت عامہ کی توقع پر جہاد میں شریک ہوگا اور جان دے گا۔

علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ جہاد میں شرکت کے لئے قرض خواہ کی اجازت ہونی چاہئے یا نہیں؟ جمہور نے اجازت کے بغیر شرکت کو جائز قرار دیا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ ادائیگیِ قرض کے لئے کوئی چیز چھوڑ جائے۔[۲]

لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اس میں فقہاء کے نقطۂ نظر کی ٹھیک سے ترجمانی نہیں ہوسکی ہے۔ قرض دینے والے اور قرض دار کے سلسلے میں فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذیل میں کسی قدر اختصار سے اسے پیش کیا جارہا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ جس شخص پر قرض ہو، چاہے وہ فوری طور پر واجب الادا نہ ہو، بلکہ اس میں تاخیر ہوسکتی ہو تو اس کے لئے دائن (قرض دینے والے) کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا جائز نہیں ہے۔ الّا یہ کہ وہ اس کی ادائیگی کا انتظام کر جائے یا اس کے لئے کوئی کفیل مقرر کردے، یا اس کے لئے کوئی چیز رہن رکھ دے۔ یہی امام شافعیؒ کی رائے ہے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس شخص کو جنگ میں شرکت کی اجازت دی ہے جو اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ اس لئے کہ غیر مستطیع شخص سے فوری طور پر قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں ہوتا اور نہ اس وجہ سے اسے قید کیا جائے گا، اس لئے قرض نہ

---

۲ ابن رشد: بدایۃ المجتہد، ۳/۴۱۰، دار الکتب العلمیۃ، لبنان، ۱۹۹۶ء

ادا کرنے پر جنگ سے اسے روکنا صحیح نہیں ہے۔ گویا اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جس کے اوپر کوئی قرض نہیں ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جہاد اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی جان دے اور شہادت حاصل کرے لیکن یہاں اس سے ایک حق ضائع ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے احادیث میں آتا ہے کہ جہاد سے قرض کے علاوہ اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ہاں اگر جہاد فرض ہو جائے تو اس کا حکم دوسرا ہے۔ لہذا اگر وہ ادائیگی قرض کے لئے کوئی چیز چھوڑ جائے، یا اس کے لئے کوئی کفیل مقرر کر جائے تو وہ بلا اجازت جنگ کے لئے جا سکتا ہے۔ امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد، عبداللہ بن حرامؓ جنگ احد میں شہید ہو گئے ان پر بہت سارا قرض تھا، ان کی طرف سے ان کے بیٹے حضرت جابرؓ نے قرض ادا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات تھی، لیکن آپؐ نے ان کی کوئی مذمت نہیں کی، بلکہ ان کی مدح فرمائی اور فرمایا: فرشتے اپنے پروں سے انہیں سایہ کیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ نوح کی آواز نے فرشتوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ حضرت جابرؓ سے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالی نے تمھارے باپ کو زندہ کیا اور براہِ راست بات کی۔[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ قرض دار، دائن یعنی قرض دینے والے، کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہیں جائے گا اگر قرض فوری طور پر واجب الادا ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے موقف میں نہ ہو، اس لیے کہ اس کے ساتھ دائن کا حق وابستہ ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دائن جہاد میں شرکت کی اجازت تو دے مگر

---

[1] ابن قدامۃ، المغنی، ۱۳/ ۲۷، ۲۸، عبداللہ بن حرامؓ سے متعلق اس حدیث کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری: کتاب الجہاد، باب ظل الملائکۃ علی الشہید۔ مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل عبداللہ بن حرامؓ۔

قرض معاف نہ کرے۔ ایسی صورت میں قرض دار کا اپنی جگہ رہنا (جہاد پر نہ جانا) مستحب ہے، تاکہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اس لیے کہ قرض کا ادا کرنا زیادہ اہم ہے اسے مقدم رکھنا چاہیے، لیکن اگر وہ دائن کی اجازت سے جہاد پر چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ دائن (قرض دینے والا) موجود نہ ہو اور قرض دار یہ وصیت کر دے کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کا قرض ادا کر دیا جائے اور اس کا انتظام بھی عملاً ہو تو جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر ادائیگی قرض کا انتظام نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ جہاد پر نہ جائے۔ اس کے لیے اپنی جگہ قیام اولیٰ ہے، تاکہ بروقت قرض ادا کر سکے۔ لیکن اگر قرض مؤجل ہو، یعنی فوری ادائیگی ضروری نہ ہو تو قرض دار جہاد پر جا سکتا ہے بشرطے کہ بظاہر حالات اس بات کا امکان ہو کہ قرض کی ادائیگی کے وقت سے پہلے واپس آ جائے گا۔[1]

قرض کے حکم میں دوسرے حقوق العباد بھی ہیں

اوپر جو احادیث گزری ہیں، ان میں صراحت ہے کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، البتہ اس کے ذمے قرض ہو تو وہ معاف نہ ہوگا۔ قرض انسانوں کے حقوق میں ایک نمایاں حق ہے، اس پر دوسرے حقوق کو بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جہاد میں شرکت اور شہادت سے انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ شرکت سے پہلے ان حقوق و واجبات سے سبک دوش ہونا یا اس کا نظم کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ اس سلسلے کی حضرت ابوقتادہؓ کی روایت کے ذیل میں امام نووی لکھتے ہیں:

قولہ صلی اللہ علیہ وسلم الا الدین، ففیہ	آپؐ کا یہ فرمان کہ قرض کے علاوہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس

---

[1] ابن عابدین: ردالمحتار مع درالمختار، ۶/۲۰۴۔ دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۴ء

التنبيه على جميع حقوق الآدميين أن الجهاد والشهاده و غيرهما من أعمال البر لايكفر حقوق الآدميين و انما يكفر حقوق الله [1]

میں انسانوں کے حقوق کے سلسلے میں خبردار کیا گیا ہے کہ جہاد اور شہادت وغیرہ نیک اعمال انسانوں کے حقوق کا کفارہ نہیں بنتے۔ اس سے بس اللہ کے حقوق معاف ہوں گے۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں:

و يلحق بالدين ما كان حقا لآدمي من دم او عرض بجامع ان كل واحد حق لآدمي يتوقف سقوطه على اسقاطه [2]

قرض ہی کے حکم میں انسان کا جو بھی حق ہے وہ آتا ہے، خواہ اس کا تعلق جان سے ہو یا عزت وآبرو سے۔ اس لئے کہ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان سب کا تعلق آدمی کے حق سے ہے۔ وہ اس کے ساقط کرنے ہی سے ساقط ہوں گے۔

علامہ تورپشتی کا بیان اور زیادہ واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

اراد بالدين هنا ما يتعلق بذمته من حقوق المسلمين اذ ليس الدائن احق بالوعيد والمطالبة منه من الجاني والغاصب والخائن

دَین (قرض) سے آپؐ کی مراد مسلمانوں (اسی طرح غیر مسلموں) کے حقوق ہیں جو اس کے ذمے ہیں۔ اس لئے کہ قرض دار وعید کا اور اس سے مطالبہ کا اتنا مستحق نہیں ہے جتنا مستحق کہ ایک قاتل، غاصب اور

---

[1] نووی: شرح مسلم، المجلد السابع، الجزء الثالث عشر، ص ۲۷، دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵ء

[2] شوکانی: نیل الاوطار ۷/۲۵۲

والسارق [1] خائن ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں 'دَین' کی جگہ 'امانت' کا لفظ آیا ہے جو زیادہ وسیع المعنی ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

القتل فی سبیل الله یکفر الذنوب کلها الا الامانة والامانة فی الصلوة والامانة فی الصوم والامانة فی الحدیث واشد ذالك الودائع [2]

اللہ کے راستے میں قتل ہونا تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے سوائے امانت کے۔ امانت نماز میں، امانت روزے میں اور امانت گفتگو میں۔ ان میں سب سے مشکل وہ امانتیں ہیں جو کسی کے پاس رکھی جاتی ہیں۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آدمی پر دوسروں کے حقوق ہوں تو جہاد سے پہلے اسے ان کے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ انہیں نظر انداز کر کے جہاد میں شرکت صحیح نہ ہوگی۔ شہادت سے بھی یہ معاف نہ ہوں گے۔

جہاد سے پہلے دعوت ضروری ہے

جہاد سے پہلے اسلام کی دعوت ضروری ہے، تاکہ جس قوم سے جہاد کیا جائے اسے معلوم ہو کہ اسلام کیا ہے، وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی جنگ یا جہاد کی کیا بنیاد ہے اور وہ کیوں جنگ کر رہا ہے؟ اس کے بغیر اسلامی ریاست کے لئے کسی ملک کے خلاف تلوار اٹھانے کا جواز نہیں ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی بھی نافرمان اور غلط کار قوم

---

[1] ملا علی قاری: مرقاۃ المفاتیح، ۷/۳۷۱

[2] رواہ الطبرانی وابونعیم باسناد صحیح، التیسیر بشرح الجامع الصغیر للمناوی: ۲/۲۰۱، طبع مصر، ۱۲۸۶ھ

پر اس کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب اللہ کا رسول اس پر دینِ حق پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور وہ حق کے اچھی طرح واضح ہونے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن مجید میں متعدد مواقع پر بیان ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (الاسراء:۱۵)

ہم (کبھی) عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیجیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ○ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ (الشعراء:۲۰۸۔۲۰۹)

ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ اس کے پاس ڈرانے والے نصیحت کے لئے بھیجے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

سورۂ قصص میں ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○ (القصص:۵۹)

تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان میں کی مرکزی بستی میں رسول نہ بھیجے، جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔ ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس وقت جب کہ ان کے لوگ ظالم ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روم و فارس یا جن ممالک سے بھی جنگ کرنی پڑی پہلے آپؐ نے انہیں اسلام کی باقاعدہ دعوت دی، اس کے لئے خطوط لکھے، پھر ان سے جنگ ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے۔

ما قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم قوما حتىٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے جنگ نہیں کی جب تک کہ

یدعوھم [۱] اسے دعوت نہ دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔

ما قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوما قط الا دعاھم [۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے کبھی جنگ نہیں کی مگر اسی وقت جب کہ انہیں دعوت دی۔

فروہ بن مسیک المرادیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری قوم کے جو لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کریں انہیں ساتھ لے کر کیا ان لوگوں سے جو اسلام سے روگردانی کریں جنگ کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں! جب میں واپس ہونے لگا تو آپ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا:

لاتقاتلھم حتیٰ تدعوھم الی الاسلام [۳] ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ تم انہیں اسلام کی دعوت نہ دو۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دینا ضروری نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مصطلق پر اچانک حملہ کیا۔ ان کو پہلے سے اس کی اطلاع نہیں تھی [۴]

---

[۱] مسند احمد: ۱/۳۸۳۔ دارمی: کتاب السیر، باب فی الدعوۃ الی الاسلام قبل القتال۔ یہ حدیث طبرانی، ابویعلی اور مستدرک حاکم میں بھی آئی ہے۔ نیل الاوطار: ۷/۲۶۲

[۲] مسند احمد: ۱/۳۹۰

[۳] رواہ احمد۔ ابوداؤد والترمذی وحسنہ، نیل الاوطار: ۷/۲۶۴، اس موضوع سے متعلق روایات کے لئے ملاحظہ ہو۔ زیلعی: نصب الرایۃ تخریج احادیث الہدایۃ مع الہدایۃ ۳/ ۵۸۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء

[۴] بخاری: کتاب العتق، باب من ملک من العرب رقیقاً۔ مسلم: کتاب الجہاد، باب جواز الاغارۃ علی الکفار الخ۔

امام نووی فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں فقہاء کے تین مسلک ہیں:

ایک یہ کہ جنگ سے پہلے 'انذار' ہر حال میں ضروری ہے۔ یہ امام مالک وغیرہ کا مسلک ہے، لیکن یہ کم زور ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ جنگ کے لئے انذار کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ یہ پہلے سے بھی کم زور بلکہ باطل ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ جس قوم سے جنگ ہو، اگر اس تک اسلام کی دعوت نہیں پہونچی ہے تو دعوت کا پہونچانا لازم ہے۔ اگر دعوت پہونچ چکی ہے تو واجب نہیں ہے، البتہ پسندیدہ ہے۔ یہی مسلک صحیح ہے۔ یہ حضرت نافع، حسن بصری، ثوری، لیث بن سعد، امام شافعی، ابوثور، ابن المنذر اور جمہور کی رائے ہے۔ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں بنوالمصطلق سے متعلق روایت بھی ہے۔ (یعنی وہ پہلے اسلام سے واقف تھے) [۱]

علامہ شوکانی نے بھی فقہاء کے مسالک کی تقریباً یہی تفصیل پیش کی ہے اور آخری مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔ [۲]

علامہ ابن رشد فقہاء کے خیالات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جہاد کی شرط بالاتفاق یہ ہے کہ جس قوم سے جہاد ہو پہلے اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس کی دلیل اللہ تعالی کا قول 'وما کنّا معذِّبینَ حتی نبعثَ رسولا'، ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کسی قوم سے ایک سے زائد بار جنگ ہو تو کیا ہر مرتبہ اسے اسلام کی دعوت دی جائے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے ہر مرتبہ دعوت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ ہر

---

۱ النووی: شرح مسلم، مجلد ۶ جزء ۱۲، ص ۳۳، دارالکتب العلمیۃ، لبنان۔ ۱۹۹۵ء

۲ شوکانی: نیل الاوطار ۷/۲۶۲،

بار دعوت پیش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ واجب ہے اور نہ مستحب۔[۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر میں تو فقہاء کا قریب قریب اتفاق ہے کہ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت لازماً دی جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جس قوم تک اسلام کا پیغام ایک مرتبہ پہنچ چکا ہے، اس سے جب بھی جنگ ہو، ہر مرتبہ اس کے سامنے اسلام کا پیش کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

فقہاء احناف کے ہاں اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث ملتی ہے۔ امام کاشانی کہتے ہیں۔

جنگ میں دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کا پیغام اس تک پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں پہنچا ہے تو پہلے یہ پہنچانا ہوگا۔ اسلام کی دعوت سے پہلے جنگ جائز نہ ہوگی۔ [۲]

علامہ ابن الہمام کہتے ہیں کہ جس قوم سے جنگ ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ جنگ لوٹ مار، یا ان کو اور ان کے بال بچوں کو غلام بنانے کے لئے نہیں ہو رہی ہے۔ (بلکہ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے) اس کا ذریعہ دعوت ہی ہے۔ اس سے ہو سکتا ہے اسلام ان کے لئے قابل قبول ہو جائے اور جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس لئے پہلے دین حق کا واضح کر دینا ضروری ہے۔ [۳]

ایک مسئلہ یہ بھی فقہاء کے سامنے رہا ہے کہ اگر کسی قوم کی طرف سے اسلامی ریاست پر اچانک حملے کا اندیشہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی اسلام کی دعوت دینے کے بعد ہی اس کے خلاف فوجی کارروائی درست قرار پائے گی، یا اس کے بغیر بھی اس کا جواز ہے؟ فقہاء نے کہا ہے کہ اس صورت میں بغیر دعوت

---

[۱] ابن رشد: بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۳/۴۳۳، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء

[۲] کاشانی، بدائع الصنائع ۷/ ۱۴۸

[۳] ابن الہمام: فتح القدیر ۵/ ۴۲۹، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء

کے بھی اسلامی ریاست جنگی اقدام کرسکتی ہے۔ چنانچہ ابن ہمام اوپر کی بحث ہی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اگر کسی قوم سے اس بات کا اندیشہ ہو کہ دعوت دینے اور اس کا ردعمل جاننے میں جو وقت صرف ہوگا، اس میں وہ تیاری کر کے ریاست پر حملہ کر دے گی تو دعوت دیے بغیر بھی اس کے خلاف کارروائی ہوسکتی ہے۔[1]

علامہ ابن عابدین نے بھی اختصار کے ساتھ یہی بات کہی ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست کا محاصرہ ہو تو حملہ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دینی چاہئے۔ اگر اس تک دعوت پہنچ چکی ہے تو ایسا کرنا مندوب اور پسندیدہ ہوگا اور اگر دعوت نہیں پہنچی ہے تو واجب ہوگا، بشرطے کہ اس سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ (مطلب یہ کہ دعوتی عمل میں ریاست کو ضرر پہنچنے کا خطرہ ہو تو بغیر دعوت کے بھی جنگی کارروائی کی جاسکتی ہے) اس کے بعد علامہ ابن ہمام کی رائے نقل کر دی ہے۔[2]

جنگ سے پہلے دعوت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جس قوم کو دعوت دی جائے، ایک خاص وقت تک اس کا ردعمل دیکھا جائے۔ اس کا منفی ردعمل سامنے آنے پر اس سے جنگ کی جائے۔ دوسری صورت یہ کہ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہوں اور اسی حال میں اسلامی فوج کی طرف سے فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہ نازک ترین حالات میں اسلام کی دعوت ہوگی۔ دونوں ہی صورتیں حسب موقع اختیار کی جاسکتی ہیں اور غالباً اختیار بھی کی گئیں۔

جن قوموں کو جنگ سے پہلے دعوت دی گئی، ان کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ ان کے حقوق اور

---

[1] ابن الہمام، فتح القدیر: ۵/ ۴۲۹، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۶/ ۲۰۷۔۲۰۸

ذمے داریاں وہی ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں کی ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ عرب کے قبائل سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان کا شمار مہاجرین میں ہوگا۔ مہاجرین ہی کی طرح ان سے معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اپنے علاقے ہی میں رہنا چاہیں تو جہاد میں ان کی شرکت نہ ہو سکے گی اور مالِ غنیمت میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ اگر اسلام قبول نہ کریں تو اسلامی اقتدار کو تسلیم کریں اور جزیہ ادا کریں۔ تیسری صورت یہ کہ اگر وہ ان دونوں باتوں کو رد کر دیتے ہیں تو ان سے جنگ ہوگی۔

صحیح مسلم اور صحاح کی بعض دوسری کتابوں کی روایت ہے۔ سلیمان بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی لشکر بھیجتے تو امیر لشکر کو تقویٰ کی اور مسلمانوں کے ساتھ خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے، جنگ میں انہیں اخلاقی حدود کا پابند رہنے کا حکم دیتے، اس کے بعد ارشاد ہوتا۔

و اذا لقيت عدوك من المشركين فادعهم الى ثلاث خصال فايتهن ما اجابوك فاقبل منهم و كف عنهم ثم ادعهم الى التحول من دارهم الى دار المهاجرين و اخبرهم انهم ان فعلوا ذلك فلهم ما للمهاجرين و عليهم ما على المهاجرين فان ابوا ان يتحولوا منها

جب تمہارا سامنا مشرک دشمنوں سے ہو تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو۔ ان میں سے جس بات کو بھی وہ اپنے لئے پسند کریں تم اسے قبول کر لو اور جنگ سے باز آجاؤ۔ (پہلے) انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسے اختیار کر لیں تو تم اسے تسلیم کر لو اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ پھر اس بات کی دعوت دو کہ وہ اپنے علاقے سے 'دار المہاجرین' (مدینہ) منتقل ہو جائیں۔ انہیں بتاؤ اگر وہ ہجرت کر

فاخبرهم انهم يكونون كاعراب المسلمين يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المومنين و لايكون لهم فى الغنيمة و الفى شيئى الا ان يجاهدوا مع المسلمين فان هم ابوا فسلهم الجزية فان هم اجابوك فاقبل منهم و كف عنهم فان هم ابوا فاستعن بالله و قاتلهم [1]

جائیں تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اور وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین کی ہیں۔ اگر وہ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوں تو انہیں بتاؤ کہ ان کی حیثیت اعرابِ مسلمین کی ہوگی جن پر اللہ کے احکام جاری ہوں گے جو تمام مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں۔ لیکن غنیمت اور فَی میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ الّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ اگر وہ اس سے انکار کر دیں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ اس کے لئے تیار ہو جائیں تو اسے قبول کرلو۔ اور ان سے جنگ سے باز رہو۔ لیکن وہ اگر اس کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کرو اور ان سے جنگ کرو۔

ہجرت کا حکم فتح مکہ سے پہلے تھا۔ جزیہ کا تعلق اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین سے ہے۔ یہاں صرف مشرکین کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے اہل کتاب کو ان

---

[1] مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث الخ۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔ ترمذی: کتاب السیر، باب ماجاء فی وصیۃ فی القتال۔

کے بعض عقائد کی بنا پر مشرکین ہی کے ذیل میں شمار کیا گیا ہو۔ اس بحث میں دعوت، جزیہ اور جہاد کی جو ترتیب بیان ہوئی ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے۔

فقہ مالکی کی کتاب 'الشرح الصغیر' میں کہا گیا ہے کہ جہاد سے پہلے اسلامی فوج فریق مخالف کو اسلام کی دعوت دے گی۔ چاہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اس سے قبل پہنچ ہی چکا ہو۔ ایک رائے یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اسی صورت میں دی جائے گی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس تک نہ پہنچی ہو۔ دعوت سے پیشتر ہی فریق مخالف خود سے جنگ شروع کر دے تو اسلامی فوج جوابی کارروائی کرے گی۔ دعوت کے نتیجے میں اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اپنی جگہ امان میں رہے گی۔ اگر دعوت کا انکار کر دے تو اس سے جزیہ کا مطالبہ ہوگا۔ اس کے لئے وہ تیار ہو جائے تو جنگ نہیں ہوگی۔ جزیہ کے لئے بھی وہ تیار نہ ہو تو اس صورت میں اس سے جنگ کی جائے گی۔[1]

دور اول کی صورت حال کے پیش نظر بعض علماء نے کہا ہے کہ آج اسلام سے کون واقف نہیں ہے۔ وہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا پیغام اور اس کے مقاصد جنگ معلوم و معروف ہیں۔ یہ دعوت دینے ہی کے ہم معنی ہے۔ امام احمد بن حنبل اسی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کی دعوت سب ہی لوگوں تک پہنچ چکی اور عام ہو چکی ہے۔ میرے علم میں اب کوئی نہیں ہے جو اسلام سے ناواقف ہو، اس لئے جنگ سے پہلے دعوت کا دینا ابتداء اسلام میں تو ضروری تھا۔ اب نہیں رہا۔

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ روم اور فارس

---

[1] احمد الدردیر، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک مع حاشیہ الصادی: ۲/ ۲۷۵، دار المعارف، مصر۔ ۱۳۹۲ھ، فقہی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۲۹۔۳۳

کی سرحدوں سے آگے ایسے لوگ ہیں جن تک دعوت نہیں پہنچی ہے، تو دعوت دینا ضروری ہوگا۔ اس سے قبل ان سے جنگ صحیح نہ ہوگی۔ اگر کسی قوم کو دعوت پہنچ چکی ہے تو از سر نو دعوت دینا بہر حال مستحب اور پسندیدہ ہے۔ [۱]

ساتویں صدی کے معروف حنفی فقیہ علامہ ابن الہمام کے نزدیک گو اسلام کا تعارف وسیع پیمانہ پر ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی دعوت ساری دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک اور افراد بھی ہیں جنہیں اس کا شعور ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ ان تک دعوت نہیں پہنچی ہے۔ ہاں! اگر ان کو دعوت پہنچ چکی ہے تو انہیں دعوت دینا واجب نہ ہوگا، بلکہ استحباب کے حکم میں ہوگا۔ [۲]

امام مالک کے ہاں یہ بات زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں، اسلامی ریاست سے قریب کی ریاست سے تو جنگ بغیر دعوت کے ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اسلام پھیل چکا ہے۔ قریب کے لوگ اس سے ناواقف نہیں ہیں لیکن جو لوگ دور کی ریاستوں میں ہیں۔ (ان کا اسلام سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے) اس لئے انہیں دعوت دینی ہوگی یہ اسلام اور جہاد کے بارے میں شکوک وشبہات کو ختم کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ [۳]

ان تفصیلات سے یہ بات قطعیت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ کسی غیر اسلامی ریاست سے جنگ سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دے۔ اس کے بغیر اس کے خلاف فوجی اقدام صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر اسلامی ریاست پر کوئی غیر اسلامی ریاست حملہ آور ہو، یا اس کے حملہ کا شدید اندیشہ ہو تو اسے اپنے دفاع کا حق ضرور حاصل ہوگا۔

---

۱ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/۲۹

۲ ابن الہمام، فتح القدیر: ۵۰/۴۲۹

۳ ابن حجر فتح الباری: ۶/۲۰۹

سربراہانِ مملکت کو رسول اللہؐ کے مکاتیب کی نوعیت

اب آیئے اس سوال پر غور کیا جائے کہ کسی غیر اسلامی ملک کو دعوتِ اسلام کا مطلب کیا ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ مدعو قوم سے صرف یہ معلوم کیا جائے گا کہ وہ اسلام یا جزیے میں سے کس چیز کو اختیار کرے گی؟ ان دونوں میں سے کسی کو وہ قبول نہ کرے تو اس سے جنگ ہوگی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سربراہان ممالک کو جو مکاتیب ارسال فرمائے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں ان مکاتیب کے مضمون سے بحث نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا پیش نظر ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ مکاتیب ارسال فرمائے تھے، یا اسلامی فوج کو یہ ہدایات دی تھیں، اس وقت اسلامی ریاست عملاً موجود تھی۔ آپ اس کے سربراہ تھے۔ آپ نے اسی حیثیت میں یہ خطوط روانہ فرمائے تھے۔ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اسلام غیر متعارف نہیں تھا بلکہ اس کا وسیع تعارف ہو چکا تھا۔ بہت سی قومیں اور قبائلِ عرب اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اسی بنیاد پر ان سے کشمکش جاری تھی۔ جو قومیں تفصیل سے اسلام سے واقف نہیں تھیں وہ آسانی سے اسے سمجھ سکتی تھیں۔

کسی ریاست کا وجود بذات خود اس کے نظریات کے تعارف کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس کے لئے لمبے دعوتی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امریکہ اور مغربی ملکوں کا وجود اور ان کا نظام حکومت خود ظاہر کرتا ہے کہ وہ جمہوریت اور سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم اور اس کے علم بردار ہیں۔ کمیونزم اور اس کے اصول و نظریات کو کمیونسٹ ممالک اور ان کے نظام حکومت کے ذریعہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جمہوری ممالک جمہوریت کی یا کمیونسٹ ممالک کمیونزم کی دعوت دیتے ہیں تو ان کے پیچھے، پوری ریاست ہوتی ہے۔ انہیں اپنی بات سمجھانے کے

لئے اس طرح دلائل کی ضرورت نہیں پیش آتی جس طرح کسی ایسے نظریہ کے سلسلہ میں پیش آتی ہے جس کے پیچھے کوئی اقتدار یا ریاست نہ ہو۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ کے قریب مسلم ممالک ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے حقیقی معنی میں اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے، کیا وہاں اسلام اس طرح جاری وساری ہے کہ اسے دیکھ کر اسلام کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جاسکے؟ پھر کیا ان میں سے کسی ملک نے دور ونزدیک کے کسی غیر مسلم ملک پر اسلام کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جہاد کا تذکرہ تو ہے لیکن جہاد کے لئے جو شرط لازم ہے وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک اہم تصنیف

اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

○ خدمتِ خلق کا صحیح تصور ○ غلط تصورات کی تردید ○ خدمتِ خلق کا اجر وثواب ○ خدمت عبادت ہے ○ خدمت سب کی کی جائے ○ خدمت کے مستحقین ○ وقتی خدمات ○ مشکلات کا مستقل حل ضروری ہے ○ رفاہی خدمات ○ خدمت کے لیے انفرادی واجتماعی جدوجہد ○ موجودہ دور میں خدمت کے تقاضے اور ان پر عمل کی شکلیں ○ خدمت کے ساتھ اخلاص ضروری ہے۔

مصنف کے جاندار قلم نے ان تمام گوشوں کو نکھار دیا ہے۔

صفحات: ۱۷۶ قیمت: -/۴۰ روپے

وقت کے اہم موضوع پر اس پہلی مستند کتاب کا انگریزی، ہندی اور تمل ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

انگریزی ترجمہ کا عنوان ہے:

THE CONCEPT OF SOCIAL SERVICE IN ISLAM

صفحات: ۱۶۵ قیمت: -/۵۰ روپے

اور ہندی ترجمہ ہے:

जन सेवा और इस्लाम

صفحات: ۱۱۹ قیمت: -/۳۰ روپے

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبۂ اسلامی پبلشرز

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵